تشریع اسلامی میں عرف و عادت کا مقام

مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

شعبۂ تحقیق و اشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149

H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001

Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

فہرست تشریعِ اسلامی میں عرف وعادت کا مقام

عرف کی حقیقت اور قسمیں 2
''عرف''لغت واصطلاح میں 2
عادت کے معنی اور تعریف 5
کیا عرف وعادت میں فرق ہے؟ 6
عرف اور اجماع میں فرق 8
عرف کی قسمیں 10
عرف قولی وعملی کی تعریف 11
عرف عام وعرف خاص کی تعریف 11
عرف صحیح اور عرف فاسد کی تعریف 12
عرف وعادت کا اعتبار 13
عرف کے معتبر ہونے کے شرعی دلائل 13
ایک شبہ کا جواب 14
عرف قولی احکام شرعیہ میں معتبر ہے 18
کیا عرف عملی معتبر ہے؟ 20
عرف عام معتبر ہے یا نہیں؟ 22
عرف خاص کا اعتبار ہے یا نہیں؟ 23
عرف کے معتبر ہونے کی شرطیں 25
عرف اگر نص عام کے معارض ہو تو 27
عرف اگر نص خاص سے ٹکرائے تو؟ 30
کیا عرف پر مبنی احکام بتغیر عرف سے بدل جاتے ہیں؟ 30
عرف اگر قیاس کے مخالف ہو تو؟ 33
قواعد عامہ کی خلاف ورزی کی صورت میں عرف کا حکم 35
عرف وعادت سے متعلق قواعد فقہیہ 36
اقوالِ فقہاء اور عرف میں تعارض 44
عرف اور ظاہر الروایۃ میں تعارض 44
عرف کی ایک مسلک سے مخالفت اور دوسرے سے موافقت ہو تو 46
کیا نئے عرف کی اتباع واجب ہے؟ 47

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشریعِ اسلامی میں عرف وعادت کا مقام

عرف وعادت، اکثر علماء وائمہ کے نزدیک، مصادرِ شریعت میں سے ایک مصدر کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسلامی شریعت میں اس کو مصدر کی حیثیت حاصل ہونا، دراصل اسلامی شریعت کی زمانہ اور ماحول کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت واستعداد کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور اس کی سرسبزی وتروتازگی اور ہردم جوان ہونے کی دلیل ہے، استاذ زکی الدین شعبان نے بہت صحیح فرمایا کہ:

''عرف، تشریع، قضاء وفتوی کے زرخیز مصادر میں سے ہے، شریعت اور فقہاء نے اس کا جو اسطرح اعتبار کیا ہے، یہ فقہ اسلامی کی زرخیزی وشادابی اور مخلوق کے درمیان فیصلہ کی صلاحیت پر دلیل ہے، خواہ وہ کہیں ہوں اور کسی زمانے میں پائے جائیں۔(۱)

فقہاء وشریعت نے عرف کا جو اعتبار کیا ہے، اس میں راز یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کا نزول وظہور اسوجہ سے ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے مصالح وحقوق کو منظّم کرے، کجی اور ٹیڑھ کو درست کرے، تحریفات کا خاتمہ کرے، اور لوگوں کے مابین جو رسومات جاری وساری ہیں، ان میں اعتدال کی راہ بتائے، پس اگر لوگوں کے معاملات وعادات واعراف میں سے وہ ایسی چیزوں کو پاتی ہے جو صالح ومفید ہوں تو وہ ان کو برقرار رکھتی ہے، یہی وہ بات ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''حجة اللّٰه البالغه'' میں بیان فرمائی ہے:

(۱) اصول الفقہ الاسلامی: ۱۹۶

فاعلم أنه ﷺ بعث بالملةالحنيفية الاسماعيلية لاقامة عوجها، و ازالة تحريفها ، واشاعة نورها ، و ذالك قوله تعالى: "**مِلَّةَ أَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ**" ، ولما كان الأمر على ذالك وجب أن تكون أصول تلك الملّة مسلمةً ، وسننها مقررةً ، اذ النبى اذا بعث الى قوم فيهم بقية سنة راشدة ، فلا معنى لتغييرها ، و تبد يلها، بل الواجب تقريرها الخ .(۱)

(جاننا چاہئے کہ نبی کریم ﷺ کوملت حنیفیۃ اسماعیلیۃ کے ساتھ بھیجا گیا،تا کہ اسکے ٹیڑھ کو درست اور اسکی تحریف کوختم اور اس کے نور کوشائع کریں،جیسا کہ اللہ کا قول ہے: "**مِلَّةَ أَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ**"(ملت ابراہیم کا اتباع کرو)،جب بات یہ ہے تو ضروری ہوا کہ اس ملت کے اصول مسلم ہوں،اوراسکے طریقے مقرر ہوں،کیوں کہ جب کسی قوم میں نبی آتا ہے جس میں سنت راشدہ سے کچھ باقی ہوتو اسکو بدلنے کے کوئی معنی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ اسکو ثابت رکھا جائے)

غرض یہ کہ عرف وعادت کا شریعت نے اعتبار کیا ہے جب کہ وہ صالح ہوں اور اصول شریعت سے مناسبت رکھتی ہوں،لہٰذا ضروری ہوا کہ عرف کے معنی اور اس کی تعریف،نیز اس کے اعتبار کیلئے شرائط وحدود پر بحث کی جائے۔

عرف کی حقیقت اور قسمیں

''عرف''لغت واصطلاح میں

سب سے پہلے،عرف وعادت کے معنی جاننے کی ضرورت ہے،لہٰذا پہلی بحث اسی سلسلہ میں ہے،عرف کے معنی لغت میں جاننے کے آتے ہیں،اور عام طور پر اس شئی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو معروف ہو اور عقل صحیح وسلیم کے نزدیک مقبول اور

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ: ۱۲۴/۱

طبیعت سلیمہ کے نزدیک مالوف و مانوس ہو، چنانچہ علامہ جرجانی "**التعریفات**" میں لکھتے ہیں:

"العرف ما استقرت النفوس علیه بشهادة العقول وتلقته الطبائع بالقبول". (۱)

(عرف وہ چیز ہے جس پر لوگوں کے نفوس عقل کی گواہی کی بنا پر قائم ہوں اور طبیعتیں اس کو قبول کر لیں)

ابو یحیٰ زکریا انصاری "الحدود الانیقة" میں فرماتے ہیں:

"العرف ما استقرت النفوس علیه بشهادة العقول وتلقته الطبائع بالقبول". (۲)

(عرف وہ چیز ہے جس پر لوگوں کے نفوس عقل کی گواہی کی بنا پر قائم ہوں اور طبیعتیں اس کو قبول کر لیں)

لغت کی مشہور کتاب "المنجد" میں ہے:

"العرف ما استقر فی النفوس من جهة شهادات العقول و تلقته الطباع السلیمة با لقبول."(۳)

(عرف وہ چیز ہے جس پر لوگوں کے نفوس عقل کی گواہی کی بنا پر قائم ہوں اور سلیم طبیعتیں اس کو قبول کر لیں)

اور لسان العرب میں ہے:

"العرف ضد النکر یقال: اولاه عرفاً ای معروفاً، وهو کل ما تعرفه الناس من الخیر، و تبسأ به، وتطمئن الیه". (۴)

---

(۱) تعریفات:۱۹۳/۱ (۲) الحدود الانیقة:۷۲/۱ (۳) منجد مادہ عرف

(۴) لسان العرب:۲۳۹/۹

یہ تو عرف کے لغوی معنی ہیں، اور فقہی اصطلاح میں عرف نام ہے اس چیز کا جس کی جمہور لوگوں نے عادت بنالی ہو اور وہ انکے مابین جاری وساری ہو، خواہ وہ چیز فعل ہو جو لوگوں کے درمیان شائع و عام ہو گیا ہو، یا وہ کوئی قول ہو جو کسی خاص معنی میں انکے مابین مستعمل ہو اسطرح کہ وہ بولا جائے تو وہی معروف معنی کی طرف ذہن متبادر ہو۔

استاذ منصور محمد الشیخ اپنی کتاب ''اصول الاحکام'' میں فرماتے ہیں:

" فالعرف ماتعارفه الناس و ألفوه، حتى استقر في نفوسهم من فعل شاع بينهم أو قول كثر استعماله في معنى خاص بحيث يتبادر منه هذا المعنى عند الاطلاق دون معناه الاصلي".(۱)

(یعنی عرف وہ ہے جو لوگوں میں متعارف ہو، اور لوگ اس سے مانوس ہو گئے ہوں، حتی کہ وہ ان کے نفوس میں پیوست ہو گیا ہو، خواہ وہ فعل ہو جو ان میں شائع ہو، یا قول ہو جسکا استعمال کثرت کے ساتھ کسی خاص معنی میں ہوتا ہو، اس طرح کہ اطلاق کے وقت یہی معنی اس سے مفہوم ومتبادر ہو، نہ کہ اسکے اصلی معنی)

استاذ مصطفیٰ محمد الزرقاء نے فرمایا کہ:

" أما في الاصطلاح الفقهي فإن العرف هوعادة جمهور قوم في قول وعمل"، (لیکن اصطلاح فقہی میں عرف قوم کی اکثریت کی عادت کا نام ہے، خواہ وہ قول میں ہو یا عمل میں)(۲)

اوپر جو عرض کیا گیا اس سے چند امور واضح ہوتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ عرف کا تحقق اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اکثر لوگوں میں عام و

---

(۱) اصول الاحکام: ۲۰۰ (۲) المدخل الفقہی الاسلامی: ۱/۱۳۲

رائج ہو جائے، یا کم از کم اس کا رواج غالب ہو، چنانچہ جمہور کا لفظ اس کی دلیل ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ عرف، عمل میں بھی ہوتا ہے اور قول میں بھی، پہلے کو عرف عملی، اور دوسرے کو عرف قولی کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ عرف جس طرح قول اور عمل میں ہوتا ہے اسی طرح کسی چیز کے ترک میں بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ استاذ عبدالکریم زیدان نے تصریح کی ہے۔(۱)

(۳) تیسرے یہ کہ فقہی واصطلاحی عرف اس وقت متحقق ہوتا ہے جبکہ وہ نفوس میں مستقر ہو اور عقول کے نزدیک مقبول ہو، لہٰذا جو امور لوگوں میں رائج ہوں مگر نہ نفوس میں مستقر ہوں اور نہ عقول کے نزدیک مقبول ہوں، وہ اصطلاحی عرف میں داخل نہیں، اگر چہ عرف کا اطلاق ان پر لغت میں ہوتا ہو، مثلاً جو امور ریاء وشہرت کی بنا پر کئے جاتے ہیں، یا اس لئے کہ انکے نہ کرنے سے معاشرے میں رسوائی ہوگی، یا لوگوں کی طرف سے ظلم ہوگا، یہ عرف فقہی میں داخل نہیں ہونگے۔

حاصل یہ کہ عرف فقہی اصطلاح میں اس قول وفعل یا ترک کا نام ہے جو اکثر لوگوں میں معروف ومعتاد ہو اور لوگوں کے نفوس وقلوب ان سے مانوس ومألوف ہوں اور عقول صحیحہ کے نزدیک وہ مقبول ومسلم ہو۔

عادت کے معنی اور تعریف

عادت کا لفظ عود یا معاودۃ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کسی کام کا بار بار کرنا، لہٰذا لغت میں عادت اس فعل کا نام ہے جس کو انسان بار بار کرے۔

منجد میں ہے :" العادة ما يعتاده الانسان أي يعود إليه مراراً متكررةً "

(عادت وہ کام ہے جس کا انسان عادی ہو یعنی بار بار اس کی طرف لوٹے اور اس

(۱) دیکھو: المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ: ۲۰۵/

کوکرے)(۱)

اور فقہی اصطلاح میں عادت کے معنے ہیں:

" ما استقر في النفوس من الأمور المتكررة المقبولة عند الطباع السليمة "

.(عادت وہ بار بار کئے جانے والے امور ہیں جو نفوس میں مستقر اور سلیم طبائع کے نزدیک مقبول ہوں)(۲)

علامہ شامیؒ نے یہی بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں:

" إن العادة ماخوذة من المعاودة فهي بتكررها و معاودتها مرةً بعد أخرى صارت معروفةً مستقرةً في النفوس والعقول متلقاةً بالقبول من غير علاقة ولاقرينة حتى صارت حقيقةً عرفية. (۳)

(یعنی عادت، معاودت سے ماخوذ ہے، پس عادت، بار بار ہونے کی وجہ سے نفوس وعقول میں مستقر ہوجاتی ہے اور وہ بغیر کسی علاقہ وقرینہ کے مقبول ہوتی ہے، حتی کہ وہ حقیقت عرفیہ بن جاتی ہے)

خلاصہ یہ کہ عادت وہ فعل ہے جو بار بار ہو اور نفوس میں درجۂ استقرار وقبولیت حاصل کرلے حتی کہ اسکا کرنا آسان اور چھوڑنا مشکل ہوجائے۔

کیا عرف وعادت میں فرق ہے؟

یہاں ایک اہم اور ناقابل فراموش سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ عرف وعادت کے مابین کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں نظریاتی طور پر علماء کا اختلاف ہے اور اس میں علماء کے تین قول ملتے ہیں:

(۱) منجد مادہ عود (۲) الاشباہ: ۲۹۶/۱ (۳) نشر العرف رسائل ابن عابدین: ۱/ ۱۱۴

(۱) اکثر علماء وفقہاء اس طرف گئے ہیں کہ عرف وعادت مفہوم کے لحاظ سے دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن مصداق کے لحاظ سے ان میں کوئی اختلاف وفرق نہیں، علامہ شامی ''نشر العرف'' میں لکھتے ہیں:

" فالعادة و العرف بمعنى واحد من حيث المصداق، وإن اختلفا من حيث المفهوم" (عرف و عادت دونوں مصداق کے لحاظ سے ایک ہی معنی میں ہیں، اگرچہ مفہوم کے لحاظ سے الگ الگ ہیں)(۱)

(۲) بعض معاصر علماء اس کے قائل ہیں کہ عرف عام اور عادت خاص ہے، ان حضرات کے نزدیک عرف ہر وہ چیز ہے جو لوگوں میں متعارف ہو، خواہ قول ہو یا فعل، اور عادت ان افعال کے ساتھ خاص ہے جو لوگوں میں معروف ہوں۔

" الاشباہ والنظائر " کی ایک عبارت سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے، چنانچہ ''فتح القدیر'' سے نقل کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:" الحقيقة تترك بدلالة العادة إذ ليست إلا عرفاً عملياً " (حقیقت، عادت کی دلالت سے ترک کردی جاتی ہے کیونکہ عادت عرف عملی ہی ہے)(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عادت ان افعال واعمال کو کہتے ہیں جو لوگوں میں معروف ہوں، نیز معلوم ہوا کہ عادت عرف کی ایک قسم ہے۔ استاذ زکی الدین شعبان نے اپنی کتاب ''اصول الفقہ الاسلامی'' میں لکھا ہے:'عرف وہ ہے جس کو اکثر لوگوں نے عادت بنالیا ہو اور وہ اس سے مانوس ہو جائیں، خواہ کوئی فعل ہو جو ان میں رائج ہو جائے، یا کوئی لفظ ہو جس کو لوگ کسی خاص معنی پر اطلاق کا عرف بنالیں، اسطرح کہ جب اسکو سنا جائے تو وہی معنی متبادر ہوں، پس پہلی قسم کو عرف عملی کہتے ہیں

---

(۱) رسائل شامی:۲/۱۱۴ (۲) الأشباہ:۱/۳۰۵

،بعض علماء اسکو عادت کا نام دیتے ہیں،اور دوسری قسم عرف قولی ہے۔(۱)

(۳) تیسرا مسلک یہ ہے کہ عادت عام ہے اور عرف خاص، یہ اوپر کے قول کے بالکل برعکس ہے،اسی قول کو استاذ مصطفیٰ الزرقانی نے اختیار کیا ہے، چنانچہ وہ اپنی کتاب ''المدخل الفقہی الاسلامی'' میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

''عرف ،عادت کی ایک قسم ہے ،پس عادت ایک عام جنس ہے جسکے تحت بہت سی انواع ہیں،ان میں سے ایک عرف ہے''۔(۲)

ایک اور جگہ اسی کتاب میں فرماتے ہیں:

" يتضح من جميع ما تقدم أن العادة أعم من العرف ، لأنها تشمل العادة الناشئة من عامل طبيعي ، والعادة الفر دية، و عادة الجمهور التي هي العرف"۔(یعنی اوپر جو عرض کیا گیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ عادت ،عرف سے عام ہے؛ کیونکہ عادت کا لفظ طبعی تقاضے سے پیدا ہونے والی عادت اور عادت فردیہ (جو کسی ایک آدمی کی عادت ہو)اور عادت جمہور جسکو عرف کہتے ہیں،ان سب کو شامل ہے)(۳)

یہ اس سلسلہ کے تین قول ہیں،لیکن حضرات فقہاء کی اکثریت اس پر قائم ہے کہ عادت وعرف مصداق کے لحاظ سے ایک ہی ہے اور فقہاء کے استعمالات اور تعبیرات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔

عرف اور اجماع میں فرق

اس سلسلہ میں اسی طرح کا ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے ،وہ یہ کہ عرف اور

---

(۱)اصول الفقہ الاسلامی:۱۹۱/(۲)المدخل الفقہی الاسلامی:۸۴۱/۲

(۳)المدخل الفقہی الاسلامی:۸۴۳/۲

اجماع میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، اور یہ فرق کئی طرح پر ظاہر ہوتا ہے:

۱- اول یہ کہ عرف کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ عوام وخواص سب میں رائج ہو جائے، لیکن اجماع کا تحقق صرف فقہائے مجتہدین کے اتفاق سے ہوتا ہے، اس میں عوام کا اعتبار نہیں، جیسا کہ امام فخر الدین الرازی نے "المحصول" میں، امام غزالی نے " المستصفی "اور "المنخول" میں اور امام سراج الدین الارمویؒ نے" التحصیل من المحصول" میں اسکی تصریح کی ہے۔(۱)

اور امام الحرمین الجوینیؒ نے البرھان میں فرمایا کہ:

" فلا شك أن العوام ، ومن شدا طرفاً قريباً من العلم لم يصر بسبب ما تحلى به من المتصرفين في الشريعة ، وليسوا من أهل الإجماع،فلا يعتبر خلافهم ولا يؤثر وفاقهم". (۲)

(یعنی اس میں شک نہیں کہ عوام اور وہ لوگ جو تھوڑا سا علم حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ اس علم سے مزین ہونے کے سبب شریعت میں تصرف کرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتے اور یہ اہل اجماع میں سے نہیں ہیں، لہذا نہ ان کا اختلاف معتبر ہے اور نہ ان کا اتفاق مؤثر ہے)

۲- دوسرے اجماع کے تحقق کیلئے، اہل اجماع کا عاقل، بالغ، مسلمان، عادل، اور اہل سنت والجماعت سے ہونا ضروری ہے، لیکن عرف کیلئے ان میں سے کوئی چیز بھی شرط نہیں، امام ابوبکر سمرقندیؒ نے" میزان الاصول فی نتائج العقول" میں

(۱) المحصول:۲۸۰/۴، مستصفی: ۱۴۳/۱، المنخول: ۳۱۰/۱، والتحصیل من المحصول: ۸۱/۲ (۲) البرھان لامام الحرمین: ۸۴/۱

اجماع کی بحث میں بہت تفصیل سے اہل اجماع کے شرائط کا ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اجماع کی اہلیت کیلئے کئی شرائط ہیں: بعض متفق علیہ ہیں، اور بعض مختلف فیہ ہیں، ان میں سے جو اتفاقی ہیں، وہ یہ ہیں: عقل، بلوغ، اسلام، عدالت اور اہل سنت میں سے ہونا، اور احکام شریعت میں فتوی دینے اور اجتہاد کی صلاحیت ہونا۔(۱)

ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں عرف کے تحقق کے لئے ضروری نہیں ہیں. فاتضح الفرق.

۳- تیسرے یہ کہ اجماع تمام اہل سنت و جماعت کے نزدیک حجت قطعیہ ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن عرف حجت قطعیہ نہیں ہے بلکہ ظنیہ ہے۔ لہٰذا اجماع سے ثابت شدہ امور کا منکر کافر ہے، لیکن عرف سے ثابت شئ کا منکر کافر نہیں ہے۔

نور الانوار میں ہے: " إن الإجما ع في الأمور الشرعية في الأصل يفيد اليقين و القطعية، فيكفر جاحده". (۲)

۴- چوتھے یہ کہ اجماع تمام علماء کے نزدیک حجت ہے جبکہ عرف کی حجیت متفق علیہ نہیں ہے، بعض علماء اسکو حجت نہیں مانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرف و اجماع کے مابین تحقق و مصداق اور حکم سب میں فرق ہے۔(واللہ اعلم)

عرف کی قسمیں

اب عرف کی قسموں کی طرف آیئے، عرف اپنے موضوع، اپنے دائرہ وحدود اور معتبر ہونے اور نہ ہونے کے لحاظ سے متعدد قسموں پر ہے، موضوع کے اعتبار سے عرف کی دو قسمیں ہیں: ایک عرف قولی، دوسرے عرف عملی؛ اور اپنے دائرے کے

(۱) میزان الأصول: ۴۹۰-۴۹۱ (۲) نور الانوار: ۲۲۵

لحاظ سے بھی اس کی دو قسمیں ہیں: ایک عرف عام، دوسرے عرف خاص؛ اور اس کے معتبر عند الشرع ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے بھی اس کی دو قسمیں ہیں: ایک کو صحیح، دوسری کو فاسد کہتے ہیں۔اب ان میں سے ہر ایک کی تعریف اور اس کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

عرف قولی وعملی کی تعریف

عرف قولی یہ ہے کہ لوگ کسی لفظ کو کسی خاص معنی کیلئے استعمال کریں، اسطرح کہ اطلاق کے وقت وہی خاص معنی ذہن میں متبادر ہوں، جیسے لفظ " دابّة" کہ عرف میں چوپائے جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے، حالانکہ لغت میں ہر اس چیز پر اطلاق کیا جا سکتا ہے جو زمین پر چلنے والی ہے؛ اسی طرح لفظ "ولد "کہ عرف میں عام طور پر صرف مذکر کیلئے استعمال ہوتا ہے جبکہ لغوی معنی کے لحاظ سے مذکر ومؤنث یعنی لڑکے ولڑکی دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

عرف عملی یہ ہے کہ لوگوں میں کوئی کام اسطرح رائج ومتعارف ہو جائے کہ وہ نفوس میں مستقر ہونے لگے، جیسے لوگوں کا گیہوں کھانا یا بھیڑ بکری کا گوشت کھانا، یا جیسے بیع تعاطی، یا جیسے آرڈر دے کر کسی چیز کا بنانا، وغیرہ یہ سب افعال ہیں جن کا رواج پایا جاتا ہے۔

عرف عام وعرف خاص کی تعریف

عرف عام یہ ہے کہ وہ تمام شہروں اور علاقوں میں رائج ومتعارف ہو، کسی طبقہ یا کسی شہر یا علاقے کے ساتھ مخصوص نہ ہو، جیسے استصناع یعنی آرڈر دیکر کسی چیز کا بنانا تمام جگہوں پر اور ہر طبقے میں رائج ہے، یا جیسے بغیر اجرت ومدت کے مقرر کئے ہوئے حمام میں داخل ہونا وغیرہ۔

عرف خاص یہ کہ کوئی خاص طبقہ یا علاقہ اس کی عادت بنالے یا اسکا رواج کرلے، جیسے اہل عراق لفظ "**دابہ**" کہکر گھوڑا مراد لیتے ہیں، یا جیسے نحوی لوگ لفظ " **اسم**" سے ایک خاص معنی مراد لیتے ہیں، یعنی وہ کلمہ جو بذات خود اپنے معنی پر دلالت کرے اور اس میں کوئی زمانہ نہ پایا جائے، اسی طرح بعض علاقوں میں بیع بالوفا کا رواج عرف خاص میں داخل ہے۔

انتباہ: یہاں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عرف عام وعرف خاص میں سے ہر ایک قولی وعملی دونوں ہوسکتے ہیں۔

عرف صحیح اورعرف فاسد کی تعریف

عرف صحیح اس عرف کو کہتے ہیں جو نصوص شرعیہ اور قواعد ثابتہ کے مناقض و مخالف نہ ہو، جیسے لوگوں میں مروج وہ معاملات ،جن میں کوئی نص شرعی وارد نہیں اوران میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی حرام کو حلال کرنے والی ہو۔

عرف فاسدہ وہ ہے کہ جو اس کے خلاف ہو یعنی جو نصوص شرعیہ میں سے کسی نص کے مناقض ہو یا قواعد شرعیہ میں سے کسی قاعدہ کے مخالف ہو، اس طرح کہ اس سے کسی حرام کا حلال کرنا لازم آئے۔

استاذ منصور محمد الشیخ اپنی کتاب ''اصول الاحکام'' میں لکھتے ہیں:

"إن كان (العرف) لا يناقض القواعد الشرعية و أحكامها الثابتة التي لا تتغير كالمعاملات التي تقودها الناس ممّا لم يرد فيه نصّ، ولم يكن فيه تحليل لشيء حرام ، إن كان العرف كذلك فهو صحيح، وإن كان مناقضاً لشيء من ذلك فهو عرف فاسد ". (۱)

(۱) اصول الاحکام: ۲۰۲

عرف وعادت کا اعتبار

شریعت میں عرف وعادت کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں جمہور علماء وفقہاء کی رائے یہ ہے کہ اعتبار ہے، اوران حضرات نے قرآن وحدیث سے اس پر استدلال کیا ہے:

عرف کے معتبر ہونے کے شرعی دلائل

(۱) قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ (یعنی عرف کے مطابق حکم دیجئے) (اعراف: ۱۹۹)

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس آیت سے عرف کے اعتبار پر استدلال کیا ہے۔(۱)

اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ "الإكليل في استنباط التنزيل" میں اس آیت سے مستنبط مسائل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" قال ابن الفرس: المعنى اقض بكل ماعرفته النفوس ممّا لا يردّه الشرع ، وهذا أصل القاعدة الفقهية في اعتبارالعرف ". (۲)

(یعنی ابن الفرس نے فرمایا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ" آپ فیصلہ کیجئے ہر اس چیز کے موافق جس کولوگ پہچانتے ہیں" یعنی جوان میں رائج ہے ان چیزوں میں سے جس کو شریعت رد نہیں کرتی ، اور یہ آیت عرف کے معتبر ہونے کے سلسلہ میں قاعدہ فقہیہ کی اصل یعنی دلیل ہے)

اس آیت میں جولفظ "عرف" آیا ہے جمہور علماء نے اس کی تفسیر کئی طرح سے

---

(۱) رسائل ابن عابدین:۱۱۵/۲ (۲) الإکلیل:۱۱۰

کی ہے، علامہ ابن العربی مالکیؒ نے اس کی تفسیر میں چار اقوال ذکر کئے ہیں:

(۱) اس سے مراد معروف چیز ہے۔

(۲) اس سے مراد "لاالہ الااللّٰہ "کہنا ہے۔

(۳) اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جنکا دین میں سے ہونا معلوم ہو۔

(۴) وہ چیزیں یعنی محاسن جن پر تمام شریعتیں متفق ہوں اور جن کا لوگ انکار نہ کریں۔(۱)

ایک شبہ کا جواب

یہاں ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ یہ بات واضح ہے کہ آیت میں عرف سے وہ فقہی واصطلاحی عرف مراد نہیں ہے جو حضرات فقہاء کے مابین دائر ہے، لہٰذا عرف کو یہاں فقہی واصطلاحی معنی پر محمول نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ یہ اصطلاح حادث ہے، اور نزول قرآن کے وقت اس اصطلاح کا کوئی وجود نہ تھا، لہٰذا عرف اصطلاحی پر اس آیت سے استدلال قابل اشکال معلوم ہوتا ہے؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اگر چہ فقہی واصطلاحی عرف مراد نہیں ہے، لیکن اس سے عرف اصطلاحی کی تائید ہوتی ہے، اور اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے، وہ اس طرح کہ مراد عرف سے معروف یعنی اچھی چیز ہے اور لوگوں کا اپنے معاملات واعمال میں کسی چیز کا رواج وعادت بھی ان کے نزدیک امور معروفہ میں سے ہے اور عقل ان کو مستحسن خیال کرتی ہے، لہٰذا یہ عرف بھی قرآنی عرف میں داخل ہوتا ہے۔

غالباً علامہ زرقانیؒ کی اس درج ذیل عبارت کا یہی حاصل ہے، وہ فرماتے ہیں:

(۱) احکام القرآن:۸۲۳/۲

"توجيه هذا الاستدلال هو أن العُرف في الآية وإن لم يكن مراداً به المعنى الاصطلاحي قد يستانس به في تائيد اعتبار العرف بمعناه الاصطلاحي؛ لأن عرف الناس في أعما لهم و معاملاتهم هو مما استحسنوه و أَلِفَتْه عقولُهم، والغالب أن عرف القوم دليل على حاجتهم إلى الأمر بالمتعارف، فاعتباره يكون من الأمور المستحسنة. (۱)

عرف کے عندالشرع معتبر ہونے کی دوسری دلیل حدیث پاک ہے۔

(۲)﴿ عن عائشةؓ أن هند بنت عتبة قالت : يا رسول الله ! أن أباسفيان رجل شحيح، وليس يعطيني ما يكفيني وولدي إلاما أخذت منه وهو لايعلم. فقال خذي مايكفيكِ وولدكِ بالمعروف﴾. (۲)

(حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ہند بنت عتبہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابوسفیان بہت بخیل آدمی ہیں، وہ اتنا خرچ نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچہ کو کافی ہو، الا یہ کہ میں ان کی بے خبری میں ان کا مال لے لوں (تو کیا مجھے یہ جائز ہے)؟ آپ نے فرمایا کہ تیرے لیے اور تیرے بچے کیلئے جو کافی ہو وہ معروف طریقہ پر لے لے)

اس حدیث میں جو آخری جملہ ہے"**خذي ما يكفيكِ وولدكِ بالمعروف**" اس میں معروف سے مراد وہ ہے جو عادتاً معلوم ہو، چنانچہ ابن حجر نے قرطبی سے نقل کیا ہے کہ "والمراد با لمعروف القدرالذي عرف بالعادة أنه الكفاية. (۳)

اس تفسیر کی بنا پر یہ حدیث عرف کے معتبر ہونے کی دلیل ہے، چنانچہ امام نووی

(۱) المدخل الفقہی الاسلامی:۱/۱۳۲ (۲) صحیح بخاری:۲/ ۸۰۸، صحیح مسلم:۲/۷۵
(۳) فتح الباري :۹/۵۰۹، اور بذل المجھود:۵/۲۹۶ میں بھی اسی طرح معروف کی تفسیر کی گئی ہے

نے شرح مسلم میں، حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اور امام قرطبی نے اس حدیث سے عرف کے اعتبار پر استدلال کیا ہے۔

امام نوویؒ اس حدیث کے فوائد گناتے ہوئے کہتے ہیں: " ومنها اعتماد العرف في الامور التي ليس فيها تحديد شرعي .(۱)

اور علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: " وفيه اعتماد العرف في الامور التي لاتحديد فيها من قِبَل الشرع، وقال القرطبي فيه اعتبار العرف في الشرعيات خلافاً لمن أنكر ذلك الخ.(۲)

معلوم ہوا کہ یہ حدیث عرف کے اعتبار پر ایک دلیل ہے۔

(۳) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کے حج کی جو تفصیل آئی ہے، اس میں عرفات کا خطبہ بھی مذکور ہے اور اس خطبہ کے اندر آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ " **ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف** " (یعنی تم پر اپنی عورتوں کا کھانا کپڑا بھی معروف طریقہ پر لازم ہے)۔(۳)

اس میں بھی معروف سے مراد عرف وعادت سے معلوم چیز ہے، اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ عورت کا کھانا اور کپڑا عرف وعادت کے مطابق دینا شوہر کے ذمہ ہے، ابن حجرؒ نے ابن بطالؒ سے نقل کیا ہے کہ:

" أجمع العلماء على أن للمرأة مع النفقة على الزوج كسوتها وجوباً، والصحيح في ذلك أن لايحمل أهل البلدان على نمط واحد، وأن على أهل كل بلد ما يجري في عادتهم بقدر ما يطيقه الزوج على قدر الكفاية لها.(۴)

---

(۱) شرح مسلم للنووي:۲/۷۵ (۲) فتح الباري:۹/۵۱۰
(۳) مسلم:۱/۳۹۷ (۴) فتح الباري:۹/۵۱۳

(علماء نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ عورت کے لیے اس کے شوہر پر نفقہ کے ساتھ وجوبی طور پر کپڑا دینا بھی ہے، اور اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ تمام شہروں کے لوگوں کو ایک ہی طریقے پر نہیں رکھا جائے گا بلکہ ہر شہر والوں پر وہی لازم ہوگا جو ان کے عرف و عادت میں، شوہر کی طاقت کے بقدر، عورت کو کفایت کرنے والی مقدار جاری ہے)

غرض اس حدیث میں بھی معروف سے یہی عرف و عادت مراد ہے، لہٰذا اس سے عرف کا معتبر ہونا معلوم ہوا۔

(۳) حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ:

ما رآه المسلمون حسناً فهو عندالله حسن "(یعنی مسلمان جسکو اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے)

اس کو امام احمدؒ، ابوداؤد طیالسیؒ، ابوسعید بن الاعرابی نے روایت کیا ہے، جیسا کہ شیخ ناصرالدین البانیؒ نے" سلسلة الاحاديث الضعيفةو الموضوعة" میں لکھا ہے۔ البانیؒ کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے، نیز لکھا کہ حاکمؒ و ذہبیؒ نے اس کو صحیح اور سخاویؒ نے حسن قرار دیا ہے۔ (۱)

میں کہتا ہوں کہ یہ روایت اگر چہ حضرت ابن مسعودؓ پر موقوف ہے مگر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ محدثین نے لکھا ہے کہ صحابہ کا قول جو عقل ورائے سے نہیں کہا جا سکتا مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ (كما حققه علماء الأصول)

اور یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، مگر اس کی سند میں سلیمان بن عمرو نخعی ہے جو کذاب ووضاع ہے، امام احمد، یحیی بن معین، قتیبہ اور اسحاق نے اس کی

---

(۱) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ: ۲/۱۷

تکذیب کی ہے۔(۱)

(اس راوی کے بارے میں محدثین کے اقوال میں نے اپنے عربی مقالے میں پیش کئے ہیں)

اس لئے یہ روایت مرفوعا ثابت نہیں ہے، ہاں یہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے جو بحکم مرفوع ہے ۔

اس حدیث سے عرف کے اعتبار پر متعدد علماء نے استدلال کیا ہے، جیسے ابن نجیمؒ نے " ا لاشباہ "میں اور ابن عابدینؒ نے" نشر العرف" میں، لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حدیث سے اجماع امت مراد ہے نہ کہ عرف، جیسے امام غزالیؒ نے " المستصفی" میں فرمایا ہے۔(۲)

یہ چند دلائل ہیں جن سے شریعت میں عرف کا اعتبار اور اس کا ایک مقام ثابت ہوتا ہے، ایک دلیل قرآن کی آیت سے دی گئی ہے، اور دو دلیلیں حدیث سے اور ایک صحابی کے قول سے جو اگر چہ روایتاً موقوف ہے مگر معنیً مرفوع ہے (واللہ اعلم)

عرف قولی احکام شرعیۃ میں معتبر ہے

پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عرف، قولی بھی ہوتا ہے اور عملی بھی ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ احکام شرعیہ میں کیا دونوں معتبر ہیں؟ جواب یہ ہے کہ دونوں معتبر ہیں۔

چنانچہ عرف قولی کے معتبر ہونے کے بارے میں فقہاء نے تصریح کی ہے .

"الاشباہ و النظائر" میں ہے کہ:

" فصل في تعارض العرف مع الشرع، فاذا تعارضا قدم الاستعمال خصوصاً في الأيمان، فإذا حلف: لا يجلس على الفراش أوعلى البساط

---

(۱) تہذیب التہذیب:۱۱۵/۳۰-۱۱۷(۲) المستصفی من الاصول:۱/۱۳۸

أو يستضئي بالسراج لم يحنث بجلوسه على ا لأرض ولا بالاستضائة بالشمس، وإن سمّاها الله فراشاً و بساطاً و سمّي الشمس سراجاً .(۱)

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر عرف کا شرعی استعمال سے ٹکراؤ ہو تو عرف کو مقدم رکھا جائے گا ،خصوصاً قسم کے باب میں ،لہٰذا کسی نے اگر یہ قسم کھائی کہ وہ فرش پر یا بساط پر نہیں بیٹھے گا ، یا سراج یعنی چراغ سے روشنی حاصل نہ کریگا ، پھر وہ زمین پر بیٹھا ، یا سورج سے روشنی حاصل کیا ، تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی حالانکہ اللہ نے زمین کو فرش و بساط اور سورج کو سراج فرمایا ہے۔

' الاشباہ'' میں فصل فی التعارض بین العرف و اللغة'' **میں لکھا ہے:**

”صرح الزيلعي وغيره بأن الأيمان مبنية على العرف لا على الحقائق اللغوية و عليها فروع، منها لو حلف لا يأكل الخبز حنث بما يعتاده أهل البلد، وفي القاهرة لايحنث إلا بخبز البرّ، وفي طبرستان ينصرف إلى خبز الأرز، وفي زبيد إلى خبزالذُرة، والدُخن، ولو أكل الحالف بخلاف ما عندهم من الخبز لم يحنث .(۲)

(امام زیلعی وغیرہ حضرات نے تصریح کی ہے کہ قسموں کا مدار عرف پر ہے نہ کہ لغوی حقائق پر ، اور اس اصول پر چند مسائل متفرع ہوتے ہیں ، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ روٹی نہیں کھائے گا تو اس کی قسم اس چیز سے ٹوٹ جائے گی جس کی اس کے شہر کے لوگ عادت رکھتے ہیں ، قاہرہ میں گیہوں کی روٹی کے سوا کسی اور روٹی کے کھانے سے وہ حانث نہ ہوگا ، اور طبرستان میں چاول کی روٹی مراد ہوگی ، اور زبید میں اس سے مراد مکئی اور باجرا کی روٹی ہوگی ، قسم کھانے والا

(۱) الاشباہ:۳۰۲/۱ (۲) الأشباہ والنظائر: ۳۰۵

اس کے علاوہ کسی اور قسم کی روٹی کھائے گا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی)

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ کا جو معنی عرف میں مستعمل ہے اسی کا اعتبار ہوگا، کسی نے قسم کھائی کہ روٹی نہیں کھاؤں گا تو روٹی کا لفظ عرف میں جس خاص چیز کیلئے مستعمل ہے اسی کے کھانے سے قسم ٹوٹے گی، ورنہ نہیں۔

فخر الاسلام بزدویؒ نے تصریح کی ہے کہ کبھی حقیقت کو عرف و عادت کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے۔(۱)

ابن قدامہ حنبلیؒ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے:

" إن أقرّ بدراهم، و أطلق في بلد أوزانهم ناقصة................. ففيه وجهان أولهما يلزمه من دراهم البلد ودنانيره، لأن مطلق الكلام يحمل على عرف بلدهم كما في البيع وا لأ ثمان" .(۲)

ابن قدامہؒ ہی نے دوسرے مقام پر لکھا کہ:

" له علی درهم كبير لزمه درهم من دراهم الاسلام لانه كبير فی العرف" .(۳)

ان تمام عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بیع وشراء میں، قسم میں، اقرار میں، اور دوسرے موقعوں پر عرف قولی احکام شرعیہ میں معتبر ومؤثر ہے۔

کیا عرف عملی معتبر ہے؟

اب رہا عرف عملی تو اسکے بارے میں بھی فقہی تصریحات ملاحظہ فرمائیں، جن سے واضح ہوگا کہ ''عرف عملی'' بھی شرعی احکامات میں معتبر ومؤثر ہے۔

ابن قدامہ حنبلیؒ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ: مکیلی وموزونی چیز کے بارے

---

(۱) کنز الاصول بزدویؒ :۸۶/۴(۲) المغنی:۱۶۹/۵(۳) المغنی:۱۷۰/۵

میں حجاز کا عرف اصل ومرجع ہے (یعنی وہاں جس کو وزنی سمجھا جاتا ہے وہ وزنی اور جس کو مکیلی سمجھا جاتا ہے وہ مکیلی ہوگی)،آگے چل کر فرمایا کہ: اور جس چیز میں حجاز میں کوئی عرف نہ ہو وہ دوصورتوں کو محتمل ہے: ایک یہ کہ حجاز میں جو چیز اس سے سب سے زیادہ مشابہ ہے اسکی طرف لوٹایا جائے، جیسے حوادث کو منصوص علیہ کے ساتھ زیادہ مشابہ کی طرف پھیرا جاتا ہے، قیاس کا یہی تقاضا ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ اپنے مقام کے عرف کا اعتبار کیا جائے، پس اگر اس کیلئے شریعت میں کوئی چیز مقرر نہ ہو تو مرجع عرف ہوگا، یہی ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ اور اس قول پر اگر اس معاملہ میں شہروں (کا عرف) مختلف ہو تو اعتبار غالب کا ہوگا اور اگر کوئی ایک غالب نہ ہو تو یہ صورت باطل ہوگی، اور پہلی صورت (کہ عرف اپنی اپنی جگہ کا معتبر ہے) متعین ہوگی، امام شافعیؒ کا مذہب انہی دوصورتوں پر ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں میں شرعا کوئی حد مقرر نہیں، ان میں عرف عملی کا معتبر ہونا امام ابوحنیفہؒ، حنابلہؒ وامام شافعیؒ سب کا مذہب ہے۔

نیز ہدایہ میں ہے: جس نے جوتا اس شرط پر خریدا کہ بائع اس کو بنا کر دے یا اس میں تسمہ لگائے تو بیع فاسد ہے، صاحب ہدایہ کہتے ہیں کہ یہ قیاس کا جواب ہے اور اس کی وجہ وہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کردی، اور استحسان یہ ہیکہ یہ تعامل (عرف) کی وجہ سے جائز ہے، پس یہ ایسا ہے جیسے کپڑا رنگنا (یعنی جائز ہے) اور ہم نے تعامل ہی کی وجہ سے " استصناع " (آرڈر دیکر کسی چیز کے بنانے) کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ (۲)

درمختار میں ہے:

---

(۱) المغنی: ۴/۲۱-۲۴ (۲) ھدایہ: ۳/۴۵

"كما يصح أيضاً وقف كل منقول قصداً فيه تعامل للناس كفأس، وقدوم، بل ودراهم، ودنانير..........إلى أن قال..........لأن التعامل يترك به القياس بخلاف مالا تعامل فيه، كثياب ومتاع الخ"۔(۱)

اس کا حاصل یہ کہ اشیاءِ منقولہ کا وقف اگر چہ قیاساً صحیح نہیں، الا یہ کہ تبعاً ہو، قصداً نہ ہو، لیکن جن منقول اشیاء کا وقف کرنا تعامل سے ثابت ہو ان چیزوں کو وقف کر سکتے ہیں، جیسے کلہاڑی، کلہاڑا، اور درہم و دینار وغیرہ؛ کیوں کہ تعامل کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے، ان تمام عبارات سے یہ معلوم ہوا کہ حضرات فقہاء نے عرف عملی کا شرعی احکامات میں اعتبار کیا ہے۔

عرف عام معتبر ہے یا نہیں؟

جیسا کہ معلوم ہو چکا، عرف قولی و عملی دونوں کی دو قسمیں ہیں، عرف عام، وعرف خاص، سوال یہ ہے کہ شرعیات میں عرف عام کا اعتبار ہے یا نہیں؟ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ عرف عام ہی شرعیات میں معتبر ہے اور اس کے معتبر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نص عام کی تخصیص کر سکتا ہے اور یہ کہ اس کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا جا سکتا ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ عرف اگر ہر طرح اور ہر صورت سے شرعی دلیل کے مخالف ہو، اس طرح کہ اس سے نص شرعی کا ترک لازم آتا ہو تو وہ ہرگز معتبر نہیں ہے، جیسا کہ محور ثالث میں اس پر بحث آئے گی۔ اور اگر دلیل شرعی کے ہر طرح مخالف نہ ہو بلکہ اس کے بعض افراد کے اعتبار سے اس کا مخالف ہو، مثلاً دلیل شرعی تو عام ہو اور عرف اس کے بعض افراد کے مخالف ہو تو وہ معتبر ہوگا، یعنی وہ اس دلیل شرعی کی

---

(۱) درمختار مع شامی: ۳۶۴/۴

تخصیص کردیگا، اسی طرح اگر عرف قیاس کے مخالف ہوتو قیاس کو ترک کردیا جائے گا۔

عرف عام کی وجہ سے دلیل شرعی کی تخصیص کی مثال استصناع ہے جو کہ معدوم کی بیع ہے، اور حدیث میں معدوم کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔(۱)

فقہاء نے تعامل وعرف کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے جس سے اس نص شرعی کی تخصیص ہوگئی ''الذخیرۃ البرھانیۃ'' میں ہے کہ:

" ألا ترى إنا جوزنا الاستصناع للتعامل، و الاستصناع بيع ما ليس عنده، وأنه منهى عنه، وتجويز الاستصناع بالتعامل تخصيص منّا للنص الذي ورد في النهى عن بيع ما ليس عنده، لا ترك للنص أصلاً ، لأنا عملنا بالنص في غيرالا ستصناع " .(۲)

اورعرف کی وجہ سے قیاس کو ترک کرنے کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی جوتا اس شرط پر خریدتا ہے کہ بائع اس میں تسمہ لگائے تو مقتضائے بیع کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ شرط اس بیع کو فاسد کردیتی ہے، لیکن پھر بھی فقہا نے اس قیاس کو ترک کر کے عرف کی وجہ سے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے۔(۳)

یہ ترک قیاس کی مثال ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرف عام کی وجہ سے نص شرعی میں تخصیص کی جاسکتی ہے اور قیاس کا ترک جائز ہے، یہی معنے ہے عرف عام کے معتبر ہونے کا۔

عرف خاص کا اعتبار ہے یا نہیں؟

رہا عرف خاص تو اصل مذہب یہ ہے کہ اس کا اعتبار نہیں ہے، جیسا کہ

(۱) أخرجه الخمسة وصححه الترمذي وابن خزيمة والحاكم، قاله ابن حجر في بلوغ المرام:۵۸

(۲) رسائل شامی:۲/۱۱۶ (۳) ہدایہ:۳/۴۵

"الاشباہ "میں تصریح کی ہے:"فا لحاصل أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص ". (۱)

اورعرف خاص کامعتبر نہ ہونا اس معنی کر ہے کہ وہ نص میں تخصیص کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اوراس کی وجہ سے قیاس کوبھی ترک نہیں کیا جائے گا، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

" وبما قررنا تبيّن لك أن ما تقدّم عن الأشباه من أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص إنما هوفي ما إذا عارض النصَ الشرعي، فلايترك به القياس ولايخصّ به أثر."(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ عرف خاص کامعتبر نہ ہونا اس صورت میں ہے جبکہ دلیل شرعی کے مخالف ہو، پس اسکی وجہ سے نہ تو قیاس شرعی کوترک کیا جائے گا، اور نہ نص کو مخصوص کیا جائے گا، لیکن جہاں نص وارد نہ ہواور نہ وہ قیاس شرعی کے معارض ہو، وہا ں عرف خاص بھی معتبر ہے۔ چنانچہ علامہ شامی نے فقہاء کی عبارت سے اس کوواضح کیا ہے، مثلاً فقہا نے یہ لکھا ہے کہ:

" العلو لا يدخل بشراء بيت بكل حق، وبشراء منزل إلا بكل حق هو له أو بمرافقه أو بكل قليل و كثير هو فيه أو منه الخ "۔(۳)

اس کے متعلق صاحب بحرالرائق نے "کافی" سے نقل کیا ہے کہ علوکا بعض صورتو ں میں داخل شراء ہونا اوربعض میں نہ ہونا کوفہ کے عرف پرمبنی ہے اور ہمارے عرف میں ہرصورت میں علوداخل شراء ہوگا، آگے لکھتے ہیں:

" و الأحكام تبتنى على العرف ، فيعتبر في كل إقليم وفي كل عصر

(۱) الأشباہ:۱/۳۱۷ (۲) رسائل شامی:۲/۱۳۳ (۳) کنزالدقائق:۲۵۰

عرف أهله"۔(۱)

یہ عبارت عرف خاص کے معتبر ہونے پر صریح ہے، پس خلاصہ یہ ہے کہ عرف خاص اگر نص یا قیاس شرعی کے معارض ہو تو اس کا اعتبار نہ ہوگا، اور اگر معارض نہ ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔

عرف کے معتبر ہونے کی شرطیں

عرف خواہ عام ہو یا خاص، اس کا اعتبار اس وقت ہوگا جبکہ ان شرائط کا تحقق ہو جن پر اسکے معتبر ہونے کو موقوف رکھا گیا ہے، اگر وہ شرائط پائی جائیں تو عرف معتبر ہوگا، ورنہ نہیں۔

وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ وہ نص شرعی سے اس طرح نہ ٹکراتا ہو جس سے نص معطل ہو جائے؛ کیوں کہ نص شرعی، عرف سے اقوی ہے، لہٰذا اقوی کو لیا جائے گا۔

علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

" أن النص أقوى من العرف لأن العرف جاز أن يكون على باطل، كتعارف أهل زماننا في إخراج الشموع والسرج إلى المقابر ليالي العيد، و النص بعد ثبوته لا يحتمل أن يكون على باطل". (۲)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

" إذاخالف العرف ، الدليلَ الشرعيَ فإن خالفه من كل وجه بأن لزم منه ترك النص ، فلاشك في رده، كتعارف الناس كثيراً من المحرمات من الربا، و شرب الخمر، ولبس الحرير والذهب ،وغير ذلك مما ورد

(۱) البحر الرائق: ۶/ ۱۳۷ (۲) فتح القدیر: ۷/ ۱۵

تحريمه نصّاً. (۱)

(یعنی عرف اگر دلیل شرعی کے ہر طرح مخالف ہو کہ اس سے نص کا ترک لازم آئے، تو اس کے مردود ہونے میں کوئی شک نہیں، جیسے بہت سے محرمات کا لوگوں میں عرف ہو گیا ہے، مثلا سود، شراب پینا، ریشم اور سونا پہننا وغیرہ. جن کی ممانعت نص میں وارد ہوئی ہے)

''الاشباہ والنظائر'' میں ہے کہ محمد بن فضلؒ فرماتے تھے کہ ناف سے لیکر بالوں کے اُگنے کے مقام تک کا حصہ چونکہ عام طور پر لوگ چھپاتے نہیں، لہٰذا اس عرف کی وجہ سے اس حصہ کا چھپانا ضروری نہیں، علامہ ابن نجیمؒ نے اس کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ " و هذا ضعيف و بعيد لأن التعامل بخلاف النص لايعتبر".(۲)

(یہ ضعیف و بعید ہے؛ کیوں کہ نص کے خلاف تعامل معتبر نہیں)

فقہاء کی ان تمام عبارات سے واضح ہوا کہ عرف کا اعتبار اسی وقت ہوگا جبکہ وہ نصوص شرعیہ کے معارض نہ ہو۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ عرف تمام لوگوں میں شائع وعام ہو، یا کم از کم اسکا رواج غالب ہو، اگر غالب نہ ہوگا تو اسکا اعتبار نہیں، ابن نجیمؒ نے فرمایا کہ:

" إنما تعتبر العادة إذا اطّردت أو غلبت، ولذا قالوا في البيع: لو باع بدراهم أو دنانير و كانا في بلد اختلف فيه النقود مع الاختلاف في المالية و الرواج انصرف إلى الأغلب". (۳)

اسی طرح علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ:

"اعلم أن كلاً من العرف العام و الخاص إنما يعتبر إذا كان شائعاً

(۱) رسائل ابن عابدین:۱۱۶/۲ (۲) الاشباہ:۲۹۸/۱ (۳) الاشباہ والنظائر:۲۹۹/۱

بين أهله يعرفه جميعهم". (۱)

(یعنی عرف عام وخاص میں سے ہرایک اسی وقت معتبر ہوگا جبکہ وہ تمام اہل عرف میں شائع وعام ہو کہ سب اس کو جان لیں)

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ عرف سابق ہو، طاری نہ ہو،''الاشباہ والنظائر'' میں ہے کہ وہ عرف جس پر الفاظ محمول ہوتے ہیں، وہ عرف مفارق سابق ہے، نہ کہ عرف متأخر، اسی لئے فقہاء نے کہا ہے "لاعبرة بالعرف الطاري"۔ (۲)

علامہ حمویؒ نے اس کے شرح میں جو لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جو عرف، لفظ بولنے سے پہلے سے قائم ہو اور برابر قائم رہے، وہ عرف مراد و معتبر ہے، اور جو عرف پہلے نہ تھا، کلام کے بعد پیدا ہوا، اس پر الفاظ کو محمول نہیں کیا جائے گا۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ کلام میں عرف کے خلاف کوئی تصریح نہ ہو، اگر عرف کے خلاف کسی بات کی تصریح کر دی جائے تو اعتبار اسی تصریح کا ہوگا، نہ کہ عرف کا۔ (۳)

عرف اگر نص عام کے معارض ہوتو

اوپر کی پیش کردہ شرطوں کی روشنی میں بعض اہم سوالات حل ہو جاتے ہیں، مثلاً یہ سوال کہ عرف اگر نص عام کے مخالف و معارض ہو تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عرف اگر نص عام سے پوری طرح معارض نہ ہو، یعنی من کل وجہ مخالف نہ ہو، بلکہ صرف بعض افراد میں اس کے مخالف ہو تو اس کا اعتبار ہے، اور اگر ہر اعتبار سے مخالف ہو تو اعتبار نہیں، جیسا کہ ہم نے محور ثانی میں اس کی وضاحت کی ہے

(۱) رسائل ابن عابدین: ۱۳۴/۲ (۲) الاشباہ: ۳۱۱/۱ (۳) راجع المدخل الفقہی: ۸۷۳/۲

کہ عرف عام نص شرعی کا مخصص بن سکتا ہے، ہاں عرف خاص چونکہ نص کا مخصص نہیں بن سکتا لہٰذا اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

علامہ شامی نے لکھا ہے:

" و إن لم يخالفه (أى إن لم يخالف العرفُ الدليلَ الشرعيَ) من كل وجه بأن ورد الدليل عاماً و العرف خالفه في بعض أفراده، أو كا ن الدليل قياساً ، فإن العرف معتبر إن كان عاماً، فإن العرف العام يصلح مخصصاً ". (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر عرف عام ہو اور نص عام سے ٹکراتا ہو، تو اگر بعض افراد کے اعتبار سے ٹکراتا ہو تو وہ معتبر ہوگا، بایں معنی کہ وہ نص کو خاص کر دے گا، لیکن اس صورت میں عرف خاص کا اعتبار نہ ہوگا، یعنی وہ نص عام کی تخصیص نہیں کر سکتا، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :" و بما قررنا تبين لك أن ما تقدم عن الأشباه من أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص ، إنما هو فيما إذاعارض النص الشرعي، فلايترك به القياس و لا يخص به الأثر". (۲)

عرف عام کی بنا پر نص عام کی تخصیص کی مثال یہ ہے کہ حدیث میں قفیز طحان سے نہی آئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ طحان کو، گیہوں پیسنے کی اجرت میں اس گیہوں کا ایک قفیز دینا منع ہے، اب اگر کوئی شخص کسی کپڑے بننے والے کو روئی یا اور کوئی چیز دیکر، بننے کی اجرت اسی سے طے کرے تو یہ بھی قفیز طحان کی نظیر ہونے کی بنا پر ممنوع ہونا چاہئے، مگر مشائخ بلخ نے ان کے عرف وتعامل کی بنیاد پر اس کو جائز قرار دیا ہے، مگر اس سے نص عام کا ترک نہیں بلکہ صرف تخصیص ہوئی ہے۔

(۱) رسائل ابن عابدین: ۱۱۶/۲ (۲) رسائل شامی: ۱۳۳/۲

علامہ شامیؒ نے ''الذخیرۃ البرھانیۃ'' سے نقل کیا ہے:

" ومشائخ بلخ كنصير بن يحيى و محمد بن مسلمة وغيرهما كانوا يُجيزون هذه الإجارةَ في الثياب لتعامل أهل بلدهم، والتعامل حجة يترك به القياس، ويخص به الأثر، وتجويز هذه الإجارة في الثياب للتعامل بمعنى التخصيص للنص الذي ورد في قفيزالطحان لأن النص ورد في قفيز الطحان لا في الحائك، إلا أن الحائك نظيره، فيكون وارداً فيه دلالةً، فمتى تركنا العمل بد لالة هذا النص في الحائك، و علمنا بالنص في قفيز الطحان كان تخصيصاً لا تركاً أصلاً "۔(۱)

(مشائخ بلخ جیسے نصیر بن یحیی اور محمد بن مسلمہ وغیرہ کپڑوں میں اس طرح کے اجرت کے معاملہ کو ان کے اہل شہر کے تعامل کی بنا پر جائز قرار دیتے تھے، اور تعامل ایسی حجت ہے جس کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا جاتا اور حدیث کی تخصیص کی جاتی ہے، اور اس اجرت کے معاملہ کو تعامل کی بنا پر جائز قرار دینا اس نص کی تخصیص کے معنی میں ہے جو قفیز طحان کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اس لیے کہ نص تو قفیز طحان کے بارے میں ہے نہ کہ کپڑا بننے والے کے بارے میں، ہاں کپڑا بننے والا اس کی نظیر ہے، لہذا یہ نص باعتبار دلالت کے اس کے بارے میں وارد ہوئی ہے، پس جب ہم اس نص کی دلالت پر عمل کو کپڑا بننے والے کے بارے میں ترک کردیں اور قفیز طحان کے بارے میں اس نص پر عمل کرلیں تو یہ تخصیص ہوئی نہ کہ بالکلیہ اس کا ترک)

پس معلوم ہوا کہ عرف عام اس معنی کر معتبر ہے کہ وہ نص عام کی تخصیص کرسکتا ہے۔

(۱) رسائل شامی:۱۱۶/۲

عرف اگر نص خاص سے ٹکرائے تو؟

لیکن عرف اگر نص خاص سے معارض ہو کہ اس پر عمل کرنے سے نص کی تعطیل لازم آئے تو اس کا اعتبار نہیں، اس لیے کہ تعامل اور عرف کی وجہ سے نص کا ترک جائز نہیں، عرف خواہ عام ہو یا خاص، مثلاً کسی جگہ یہ عرف ہو جائے کہ پیسنے والے کو گیہوں کا ایک قفیز اجرت میں دیتے ہیں تو اس عرف کی بنا پر یہ جائز نہ ہوگا؛ کیونکہ اس پر عمل کرنے سے نص کی تعطیل لازم آتی ہے، جو قفیز طحان کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔

چنانچہ "الذخيرة البرهانية" میں لکھا ہے: "و هذا بخلاف ما لو تعامل أهل بلدة قفيز الطحان، فإنه لايجوز، ولاتكون معاملتهم معتبرةً ، لأنا لو اعتبرنا معاملتهم كان تركاً للنص، و بالتعامل لايجوز ترك النص أصلاً و إنما يجوز تخصيصه". (۱)

(یہ اس صورت کے بخلاف ہے کہ کسی شہر والے خود قفیز طحان کا معاملہ کریں کہ یہ جائز نہیں ہے، اور ان کا یہ معاملہ معتبر بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اگر ہم ان کے اس معاملہ کا اعتبار کریں تو نص کا ترک لازم آئے گا، اور تعامل کی وجہ سے بالکلیہ نص کا ترک جائز نہیں، بلکہ صرف نص کی تخصیص جائز ہے)

کیا عرف پر مبنی احکام، تغیر عرف سے بدل جاتے ہیں؟

اس ضمن میں ایک نہایت اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو احکام عرف پر مبنی ہوتے ہیں، عرف کے بدل جانے سے کیا ان احکام میں بھی تغیر ہوتا ہے؟

اس مسئلہ میں علماء کے مابین اختلاف ہے، جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ

---

(۱) رسائل شامی: ۱۱۶/۲

شریعت نے جن احکام کو بیان کردیا ہے، وہ اگر چہ مبنی برعرف ہوں مگر ان میں کبھی تغیر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جن چیزوں کو کیلی (ناپی جانے والی) قرار دیدیا ہے، وہ ہمیشہ کیلئے کیلی ہونگی اور جنکو وزنی (وزن کی جانے والی) قرار دیا ہے وہ ہمیشہ کیلئے وزنی ہونگی، اگر چہ کہ عرف بدل گیا ہو اور لوگ کیلی کو وزنی اور وزنی کو کیلی قرار دے لیں۔

صاحب ھدایہ نے لکھا ہے:

" کل شيء نصّ رسول اللّٰه ﷺ على تحريم التفاضل فيه كيلاً فهو مكيل أبداً ، وإن ترك الناس الكيلَ فيه ، مثل الحنطة و الشعير و التمر والملح، و كل شيء نص على تحريم التفاضل فيه وزناً فهو موزون أبداً ، وإن ترك الناس الوزنَ فيه، مثل الذهب و الفضة، لأن النص أقوى من العرف"۔(۱)

(ہر وہ چیز جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے باعتبار کیل کے کمی بیشی کو حرام قرار دیا ہے وہ ہمیشہ مکیلی ہوگی، اگر چہ کہ لوگوں نے اس میں ناپنا چھوڑ دیا ہو، جیسے گیہوں، جو، کھجور، نمک، اور ہر وہ چیز جس کے اندر باعتبار وزن کے اللہ کے رسول ﷺ نے کمی بیشی کو حرام قرار دیا ہے وہ ہمیشہ موزونی ہوگی، اگر چہ کہ لوگوں نے اس میں وزن کرنا چھوڑ دیا ہو، جیسے سونا اور چاندی، کیونکہ نص عرف سے زیادہ قوی ہے) درمختار وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔(۲)

یہ جمہور کا قول ہے اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں عرف کا اعتبار کرتے ہوئے، حکم میں تبدیلی ہوگی؛ کیونکہ بعض اشیاء کا کیلی اور بعض کا وزنی قرار

(۱) الھدایہ:۳/۶۴ (۲) دیکھو: درمختار مع شامی:۵/۱۷۶، الجوھرۃ النیر ۃ:۲/ ۴۴، البحر الرائق:۶/۱۲۹

دیا جانا، اس بنا پر ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں وہ چیزیں کیلی یا وزنی تھیں، تو معلوم ہوا کہ اصل چیز عرف ہے، پس جب عرف بدلے گا تو حکم بھی بدلے گا۔

علامہ شامیؒ نے امام ابو یوسف کے قول کی تشریح کرتے ہوئے ''نشر العرف'' میں لکھا ہے کہ:

" و إنما أراد (أبو يوسفؒ) تعليل النص بالعادة بمعنى أنه إنما نص على البرّ و الشعير و التمر والملح بأنها مكيلة، وعلى الذهب والفضة بأنها موزونة ؛ لكونهما كانا في ذلك الوقت كذلك، فالنص في ذلك الوقت إنما كان للعادة، حتى لو كانت العادة في ذلك الوقت وزن البرّ وكيل الذهب لورد النص على وفقها ، فحيث كانت العلة للنص على الكيل في البعض ، والوزن في البعض هي العادة تكون العادة هي المنظور إليها"۔(۱)

درمختار ونشر العرف میں ہے کہ علامہ ابن ہمامؒ نے ابو یوسفؒ کے قول کو راجح قرار دیا ہے، اور علامہ ابن تیمیہؒ کا کلام بھی اسی طرف مشیر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

" فالناس في مقادير الدراهم والدنانير على عادتهم، فما اصطلحوا عليه وجعلوه درهماً فهو درهم، وما جعله ديناراً فهو دينار، وخطاب الشارع يتناول ما اعتادوه سواء كان صغيراً أو كبيراً "۔(۲)

علامہ ابن القیمؒ کے کلام سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عرف پر مبنی احکام، عرف کے بدل جانے سے، متغیر ہوتے ہیں، چنانچہ آپ نے ''اعلام الموقعین'' میں لکھا ہے کہ:

(۱) رسائل ابن عابدین: ۱۱۸/۲ (۲) فتاوی ابن تیمیۃ: ۲۴۹/۱۹

"إن النبی ﷺ فرض صدقة الفطر صاعاً من تمر، أو صاعاً من شعير،أوصاعاً من زبيب،أوصاعاً من أقط ، و هذه كانت غالب أقواتهم بالمدينة ، فأمّا أهل بلد أو محلة قوتهم غيرذلك فإنما عليهم صاع من قوتهم. قال: وإنما نص على الأنواع المخرجة لأن القوم لم يكونوا يعتادون اتخاذ الأ طعمة يوم العيد، بل كان قوتهم يوم العيد كقوتهم سائرَالسنة ،ولهذا لما كان قوتهم يوم عيد النحرمن لحوم الأضاحي أُمِرُوْا أن يطعموا منها القانع و المعتر، فإذاكان أهل بلد أو محلة عادتهم اتخاذ الأطعمة يوم العيد جاز لهم بل يشرع لهم أن يواسوا المساكين من أطعمتهم". (۱)

علامہ کی یہ عبارت اس فصل میں ہے جس میں ،زمانہ،جگہ،حالت ونیت کے بدل جانے سے فتاوی میں تغیر کی بحث فرمائی ہے ،غرض یہ مسئلہ اختلافی ہے ،احوط جمہور کا مسلک ہے،دوسرا مسلک اوسع ہے۔

عرف اگر قیاس کے مخالف ہوتو ؟

عرف اگر قیاس شرعی کے معارض ومخالف ہو،تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا عرف کا اعتبار کیا جائے گا یا قیاس پر عمل کیا جائے گا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہیں:

(۱) عرف اگر عام ہو اور قیاس اس کے مخالف ہوتو عرف کا اعتبار کیا جائے گا اور قیاس کو ترک کر دیا جائے گا۔شامی نے لکھا ہے:

"فإن العرف العام يصلح مخصصاً كما مرّ عن التحرير، و يترك به

(۱) إعلام الموقعین:۳/۱۲-۱۳

القياس كما صرحوا به في مسئلة الاستصناع ، ودخول الحمام، و الشرب من السقاء"۔(۱)

علامہ ابن نجیمؒ اور علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:

" صح بيع نعل على أن يحذوه أو يشرّكه ، والقياس فساده لما فيه من النفع للمشتري مع كون العقد لا يقتضيه ، وماذكره جواب الاستحسان للتعامل ". (۲)

خلاصہ یہ کہ جوتا اس شرط پرخریدنا کہ اس میں بائع تسمہ لگائے یا چمڑا اس شرط پرخریدنا کہ بائع اس کا جوتا بنائے ، یہ شرط فاسد ہے،اور تقاضائے عقد کے خلاف ہے لہٰذا قیاس کہتا ہے کہ یہ بیع فاسد ہو،مگر اس قیاس کو ترک کر کے علماء نے عرف وتعامل کی بنا پر اس بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ عرف عام کی بنا پر،قیاس کو ترک کیا جاتا ہے،اگر وہ عرف کے مخالف اور معارض ہو۔

(۲) اگر عرف خاص ہوتو قیاس کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہ ہوگا،لہٰذا قیاس کو ترک نہیں کیا جائے گا،جیسا کہ اوپر شامی کی عبارت نقل کی گئی ہے۔

اور وجہ یہ ہے کہ قیاس شرعی ادلۂ شرعیہ میں سے ہے،اس کا معارضہ ومقابلہ صرف ایسی دلیل کرسکتی ہے جو اس سے قوی ہو، یا کم از کم اس کے مثل ہو،اور عرف خاص اگر چہ دلیل شرعی ہے،مگر قیاس کے مقابلہ میں اس درجہ کی نہیں ہے۔ چنانچہ قیاس سے حکم عام ثابت ہوتا ہے اور عرف خاص سے حکم عام ثابت نہیں ہوتا، بلکہ صرف حکم خاص ثابت ہوتا ہے۔

---

(۱) رسائل شامی:۲/۱۱۶ (۲) بحرالرائق:۶/۸۸،ردالمحتار:۵/۸۸

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں : إن حکم العرف یثبت علی أھله عاماً أو خاصاً، فالعرف العام في سائرالبلاد یثبت حکمه علی أھل سائر البلاد، و الخاص في بلدة و احدة یثبت حکمه علی تلك البلدة فقط“. (۱)

غرض یہ کہ عرف خاص اگر قیاس کے معارض ہوتو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اوراس کی وجہ سے قیاس کوترک نہیں کریں گے۔

قواعد عامہ کی خلاف ورزی کی صورت میں عرف کا حکم

کیا عرف اس صورت میں قابل اعتبار ہوسکتا ہے جبکہ وہ شریعت کے قواعدعامہ کےخلاف ہو؟اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں؛ کیونکہ قواعدشرعیہ عامہ ایسے محکم اور قطعی ہوتے ہیں کہ وہ تغیر وتبدل کوقطعا قبول نہیں کرتے ،اورعرف ظاہر ہے کہ ایک ضمنی چیز ہے جوقطعیت کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا ،لہذا عرف قواعدشرعیہ کا معارض ومقابل نہیں ہوسکتا،اور جوعرف قوائدشرعیہ کا معارض ہووہ واجب الرد ہوگا۔

استاذ زکی الدین شعبان نے لکھا ہے:

”و لا نزاع بین العلماء في أن العرف إذا کان مخالفاً للأدلة الشرعیة وأحکامه الثابتة التي لاتتغیر باختلاف البیئات و العادات لا یلتفت إلیه ، ولا یعتدّ به بل یجب الغاؤه“. (۲)

اوراستاذ منصور محمد الشیخؒ لکھتے ہیں:

” و إن کان (أی العرف) مناقضاً لشیء من ذلك (أی القواعد الشرعیة) فھو عرف فاسد لایلتفت إلیه ولایعول علیه بل یتعین محاربته و القضاء علیه“. (۳)

(۱)رسائل شامی:۱۳۲/۲(۲)اصول الفقہ الاسلامی:۱۹۴(۳) أصول الأحکام:۲۰۲

عرف و عادت سے متعلق قواعد فقہیہ

جاننا چاہئے کہ حضرات فقہاء علیہم الرحمہ نے عرف و عادت سے متعلق متعدد قواعد وضع کئے ہیں اور ان قواعد سے عرف کے معتبر ہونے یا غیر معتبر ہونے کے شرائط، نیز ان سے متعلق احکام کا علم بھی ہو جاتا ہے، لہٰذا یہاں ان فقہی قواعد کو مختصر تشریح و توضیح کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

(۱)العادة مُحكِمة

یعنی عرف و عادت شرعی حکم کے ثابت کرنے کے لئے ایک دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲)استعمال الناس حجة يجب العمل بها

یعنی لوگوں کا عادت کے طور پر کسی چیز کا استعمال حجت ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے، مگر یہ وہاں ہے جہاں نص شرعی وارد نہ ہو اور استعمال کا معنے بعض علماء نے یہ بتایا کہ یہ (استعمال) اور عادت دونوں مترادف ہیں اور بعض نے فرمایا کہ استعمال کے معنے ہیں لفظ کو اس کے مجاز شرعی کی طرف نقل کرنا، اور عادت یہ ہے کہ لفظ کو اس کے مجاز عرفی کی طرف منتقل کرنا۔(۱)

(۳)العادة إنما تُعتبر إذا اطّرد تْ أو غلبت

یعنی عادت اس صورت میں قابل اعتبار ہوگی جب کہ وہ تمام لوگوں میں پھیل جائے یا یہ کہ وہ غالب ہو، اس طرح کہ اکثر لوگوں میں پھیل جائے، پس اگر صرف خواص میں یہ شائع ہو، عام لوگوں میں شائع نہ ہو تو اتنی سی بات سے تعارف ثابت نہ

---

(۱) کمافی الأشباہ:۱/۳۹۶

ہوگا، یعنی یہ عرف وعادت میں داخل نہ ہوگا۔ (۱)

(۴)الثابت بالعرف کالثابت بالنص

جوعرف سے ثابت ہو وہ ایسا ہے جیسے نص سے ثابت ہو، علامہ ابوزہرہ نے فرمایا کہ شاید اسکا مطلب یہ ہے کہ جوعرف سے ثابت ہوتا ہے وہ ایک ایسی دلیل سے ثابت ہے جس پر نص کی طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے، جب کہ نص موجود نہ ہو۔ (۲)

میں کہتا ہوں کہ پھر اس اصول کا معنی یہ ہوگا کہ عرف حجت شرعیہ ہے، جس طرح کہ نص ہے، اگر چہ مرتبہ میں اس سے کم ہو، اور یہ معنی بالکل صحیح ہیں۔

(۵)التعیین بالعرف کالتعیین بالنص

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن امور میں نص شرعی وارد نہیں، ان کی عرف وعادت سے تعیین کرنا بلحاظ حکم ایسا ہے جیسے نص کے ذریعہ تعیین کرنا، جیسے وہ اشیاء جن کے مکیلی یا موزونی ہونے کی شارع نے تصریح نہیں کی ہے، تو ان میں مرجع عرف وعادت ہے۔

(٦)الحقیقة تترک بالعادة والاستعمال

فخر الاسلام بزدویؒ نے فرمایا کہ:

''حقیقت کبھی عادت اور استعمال کی وجہ سے ترک کر دی جاتی ہے، جیسے لفظ ''صلوۃ'' کہ دعا کا نام ہے، اللہ تعالی نے فرمایا کہ '' **وصل علیھم** ''(یعنی ان کے لئے دعا کرو) مجازاً عبادت معروفہ معلومہ کا نام رکھا گیا ہے، کیونکہ نماز (عبادت معلومہ) ذکر کیلئے مشروع ہوئی ہے، جیسے اللہ نے فرمایا''**و أقم الصلاۃ لذکری**'' اور ہر ذکر دعا ہے (لہذا نماز کو صلوۃ کہا گیا) اور جیسے حج کہ اس کے معنی لغت میں ارادہ

---

(۱) الاشباہ: ۱/۳۱٦، رسائل شامی: ۲/۱۳۴ (۲) اصول الفقہ لابی زھرۃ: ۲۷۳

کرنے کے ہیں، پس وہ ایک معلوم عبادت کا نام ہو گیا مجازاً؛ کیونکہ حج میں قطع مسافت کا پختہ ارادہ وعزم ہوتا ہے، اسی طرح دیگر نظائر میں جیسے عمرہ، زکوۃ، حتی کہ حقیقت متروک ہوگئی، عرف وعادت کا ترکِ حقیقت پر دلالت کرنا، اس لئے ہوتا ہے کہ کلام لوگوں کے استعمال اوران کی حاجت کیلئے بنایا گیا ہے، پس مجاز ہی ان کے استعمال کی وجہ سے حقیقت کے برابر ہوگا''۔(۱)

(۷) المعروف عرفاً کالمشروط شرطًا

علامہ ابن نجیمؒ نے اشباہ میں اس قاعدہ پر مبسوط کلام کیا ہے، اسی طرح علامہ شامیؒ نے بھی نشر العرف میں اس پر کلام کیا ہے، اس قاعدہ پر جن جزئیات کو متفرع کیا گیا ہے، ان میں سے ایک یہ کہ اگر باپ اپنی بیٹی کو جہیز دیا پھر یہ دعوی کیا کہ عاریۃً دیا تھا اور اس پر کوئی گواہ نہ ہو تو اس میں اختلاف ہے، فتوی اس پر ہے کہ اگر عرف یہ چل رہا ہو اور چلتا آیا ہو کہ باپ اس جہیز کو ملکیت کے طور پر دیتا ہے، نہ کہ عاریت کے طور پر تو باپ کا یہ دعوی قبول نہ ہوگا، ہاں اگر یہ عرفِ مشترک ہو، یعنی ملکیت کے طور پر اور عاریت کے طور پر دونوں طرح کا عرف ہو تو باپ کے دعوے کو مان لیا جائے گا۔(۲)

(۸) العادة تجعل حكماً إذا لم يوجد التصريح بخلافه

عادت کو اس وقت حکم قرار دیا جائے گا جب کہ (عادت) کے خلاف تصریح نہ ہو۔

(۹) العرف يسقط اعتباره عند وجود التسمية بخلافه

عرف کا اعتبار اس وقت ساقط ہو جا تا ہے، جب کہ اس کے خلاف تصریح موجود ہو۔

(۱) کنز الأصول للبزدویؒ: ۸۷ (۲) الأشباه: ۱/۲۹۷

ان دونوں قواعد (۸و ۹) کا معنی ظاہر ہے کہ عرف کا اعتبار اسی وقت ہوگا جب کہ اس کے خلاف تصریح اور بیان نہ ہو اور یہ اعتبار عرف کے شرائط میں سے ایک شرط ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

(۱۰)العرف غير معتبر في المنصوص عليه

منصوص علیہ میں عرف کا اعتبار نہیں ہے، یہ قاعدہ بھی اعتبار عرف کے شرائط میں سے ایک شرط ہے اور اس کی شرح محور ثالث میں گزر چکی ہے۔

"الأشباه" میں ہے کہ:

اموال ربویہ میں سے جن کے بارے میں نص وارد نہیں ہوئی، ان کے مکیلی یا موزونی ہونے میں عرف کا اعتبار ہوگا اور جن میں نص وارد ہوئی ہے کہ یہ مکیلی یا وزنی ہیں ان میں عرف کا اعتبار نہ ہوگا یہ امام ابوحنیفہ وامام محمد کے نزدیک ہے۔(۱)

علامہ ابو زہرہؒ نے فرمایا ہے کہ "إن العلماء الذين يقررون أن العرف أصل من أصول الاستنباط يقررون أنه دليل حيث لا يوجد نص من كتاب أو سنة ۔(۲)

(۱۱)النص أقوى من العرف

یہ قاعدہ حقیقت میں اوپر والے قاعدہ کی تعلیل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عرف منصوص علیہ میں اس لیے معتبر نہیں کہ نص عرف سے اقوی ہے، اور یہ مسلم ہے کہ اقوی کو ادنی کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا۔(۳)

(۱۲)العادة معتبرة في تقييد مطلق الكلام

عادت مطلق کلام کی تقیید میں معتبر ہے۔

(۱) الأشباه: ۱/۳۰۹ (۲) أصول الفقه: ۲۷۳ (۳) دیکھو: الدر المختار مع شامی: ۵/۱۷۶

(۱۳)المطلق يتقيد بدلالة العرف

مطلق عرف کی دلالت سے مقید کیا جاسکتا ہے۔

(۱۴)مطلق التسمية ينصرف إلى ماهو المعروف بالعرف

مطلق ذکر، عرف کی وجہ سے معروف کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔

یہ تینوں قواعد (۱۲، ۱۳، ۱۴) ایک ہی معنی رکھتے ہیں کہ جب کلام میں اطلاق سے کام لیا جائے تو اس سے وہ مراد ہوتا ہے جو عرف و عادت میں معروف ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی نے بیع کے موقعہ پر قیمت بیان کرنے میں اطلاق سے کام لیا تو شہر میں جو غالب نقد ہے اس پر محمول کیا جائے گا کیوں کہ یہی متعارف اور معروف ہے۔(۱)

اسی طرح اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ روٹی نہیں کھائے گا تو کون سی روٹی مراد ہوگی؟ ابن نجیمؒ نے اسی قاعدے کے مطابق لکھا ہے کہ اس کے اہل شہر جس روٹی کے عادی ہیں اس روٹی کو کھائے گا تو حانث ہوگا۔ قاہرہ میں گیہوں کی روٹی سے حانث ہوگا، طبرستان میں اس سے مراد چاول کی روٹی ہوگی، اور زبید میں مکئی اور باجرہ کی روٹی مراد ہوگی، ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ اگر قسم کھانے والا دوسری قسم کی روٹی کھائے گا تو حانث نہ ہوگا۔(۲)

اسی قاعدے کی فرع میں سے یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ گھر میں نہیں داخل ہوگا، پھر چرچ (عیسائی عبادت خانہ) یا مجوس کے عبادت خانہ یا کعبۃ اللہ میں داخل ہوا تو حانث نہ ہوگا، اس لیے کہ مطلق کلام متعارف اور معروف بالعادۃ والعرف سے مقید ہوتا ہے۔

---

(۱) الهداية: ۳۰/۴، وغیرہ (۲) الاشباہ والنظائر: ۳۰۵/۱

(۱۵) للعرف عبرة في معرفة المراد بالاسم

اسم کی مراد جاننے میں عرف کا اعتبار ہے ۔علامہ عمیم الاحسان مجددیؒ نے '' قواعد الفقه'' میں اس قاعدے پر لکھا ہے کہ امام محمدؒ نے سیر کبیر میں ایک مسئلے میں اس کو لکھا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے امن طلب کرتے ہوے کہا کہ میرے آزاد کردہ غلاموں (موالی) کو امن دو، حالانکہ اس کے آزاد کردہ غلام نہیں ہیں، بلکہ صرف آزاد کردہ لونڈیاں ہیں تو ان آزاد لونڈیوں کو ہی اس (موالی) سے مراد لے کر ان کو امن حاصل ہوگا، وجہ یہ ہے کہ اہل لغت آزاد باندیوں کو بھی موالی بنی فلاں کہہ دیتے ہیں اور مراد جاننے میں عرف کا اعتبار ہے۔(۱)

علامہ شامیؒ نے "عقود رسم المفتي'' میں فرمایا ہے: کہ فتاوی علامہ قاسمؒ میں ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ واقف، وصیت کرنے والے، قسم کھانے والے، نذر ماننے والے اور ہر معاملہ کرنے والے کے الفاظ اس کے اس عرف وعادت پر محمول کئے جائیں گے جس میں وہ کلام کر رہا ہے، خواہ عرب اور شرع کی لغت کے موافق ہو یا نہ ہو۔

ان کے الفاظ یہ ہیں: " التحقيق أن لفظ الواقف والموصي والحالف والناذر وكل عاقد يحمل على عادته في خطابه ولغته التي يتكلم بها، وافقت لغة العرب والشرع أولا''. (۲)

(۱٦) يخص القياس والأثر بالعرف العام دون الخاص

قیاس اور حدیث، عرف عام سے خاص کئے جاسکتے ہیں نہ کہ عرف خاص سے۔اس مسئلے پر اوپر ہم نے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عرف سے قیاس اور اثر (حدیث) کی تخصیص اس وقت ہوگی جب کہ عرف عام ہو، بلکہ عرف عام کی وجہ سے

(۱) قواعد الفقہ :۱۰۴ (۲) رسائل شامی:۱/۸

قیاس کوترک بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ گذر چکا۔ رہا عرف خاص تو اس سے نہ تو اثر کی تخصیص ہوسکتی ہے اور نہ قیاس کوترک کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ عرف عام معتبر ہے اور عرف خاص معتبر نہیں، اس کا یہی مطلب ہے۔

(۱۷)إن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص

اصل مذہب یہ ہے کہ عرف خاص کا اعتبار نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرف خاص اگر نص شرعی سے معارض ہوتو اس کا اعتبار نہیں ہے، لہٰذا اس سے نہ قیاس کوترک کیا جائے گا اور نہ اثر کی تخصیص ہوگی اور اگر وہ نص شرعی سے معارض نہ ہو، بلکہ نص فقہی کے معارض ہو، جو صاحب مذہب سے منقول ہے تو پھر عرف خاص کا اعتبار کیا جائے گا۔(۱)

(۱۸)لا عبرة بالعرف الطاري

عرف طاری کا کوئی اعتبار نہیں۔ الاشباہ میں ہے کہ جو عرف کہ اس پر الفاظ کو محمول کیا جاتا ہے وہ صرف وہ ہے جو مقارن سابق ہو (یعنی لفظ کے استعمال سے پہلے وہ عرف جاری ہوا اور اب تک برابر جاری رہے) نہ کہ وہ جو متأخر ہو (یعنی بعد میں جاری ہوا ہو) اسی لیے فقہاء نے کہا ہے کہ لا عبرة بالعرف الطاری اور اسی لیے (عرف کا) اعتبار معاملات میں کیا گیا ہے، تعلیق میں اعتبار نہیں کیا گیا۔

حمویؒ نے اشباہ کے اس قول پر تعلیقا لکھا ہے کہ عادت غالبہ، مطلق لفظ کو مقید اس صورت میں کرتی ہے جب کہ اس کا تعلق کسی امر کے فی الحال ہونے سے ہو، نہ کہ اس صورت میں جب کہ وہ پہلے امر کی خبر واقع ہو، پس عرف متأخر سے (امر مقدم)

---

(۱) کما حققه العلامة الشامي في نشر العرف رسائل ۲/ ۳۲

مقید نہیں ہوگا۔(۱)

(۱۹)العرف العام يثبت به الحكم العام ،والعرف الخاص يثبت به الحكم الخاص

عرف عام سے حکم عام ثابت ہوتا ہے،اور عرف خاص سے حکم خاص ثابت ہوتا ہے۔

علامہ شامیؒ نے عقود رسم المفتی میں لکھا ہے:" اعلم أن العرف قسمان : عام وخاص ، والعام يثبت به الحكم العام ، ويصلح مخصصاً للقياس والأثر ، بخلاف الخاص فإنه يثبت به الحكم الخاص ما لم يخالف القياس أو الأثر فإنه لا يصلح مخصصاً". (۲)

(۲۰) لا ينكر تغير الاحكام بتغير الايام

ایام کے بدلنے سے احکام کے بدلنے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو احکام عرف وعادت پر مبنی ہوتے ہیں وہ عرف وعادت کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں۔

امام قرافی جو مالکیہ میں سے ہیں وہ اپنی کتاب " الإحكام فی تمييز الفتاوى والأحكام" میں فرماتے ہیں :" إن إقرار الأحكام التي مدركها العادات مع تغيير تلك العادات خلافُ الإجماع، وجهالة بالدين بل كل ما هو فی الشريعة يتبع العادات يتغير الحكم فيه عند تغيير العادة إلى ما

(۱) الأشباہ مع حاشیۃ الحمویؒ:۱/۳۱۱-۳۱۲ (۲) رسائل شامی:۱/۴۷

تقتضيه العادة المتجددة . (۱)

(یعنی جن احکام کا مبنی عادت پر ہے، ان کو ان عادات کے بدل جانے کے باوجود، اسی طرح باقی رکھنا اجماع کے خلاف اور دین سے جہالت ہے، بلکہ جو چیز شریعت میں عادات کے تابع ہو تو اس میں عادات کے بدل جانے سے حکم بھی نئی عادت کی طرف بدل جاتا ہے)

یہ چند قواعد ہیں جن میں سے اکثر علامہ عمیم الاحسان مجددیؒ کی قواعد الفقہ سے لئے گئے ہیں اور بعض علامہ ابن نجیمؒ کی ''الاشباہ'' سے اخذ کئے گئے ہیں۔

اقوالِ فقہاء اور عرف میں تعارض

فقہاء کرام کے اقوال اگر عرف وعادت سے معارض ہوں تو کیا کیا جانا چاہئے؟ فقہاء کی تصریح پر عمل کیا جائے یا عرف و عادت کی طرف رجوع کیا جائے؟ یہ ایک اہم موضوع ہے، جس کی مختلف صورتیں ہیں، ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

(۱) عرف اور ظاہر الروایۃ میں تعارض

عرف اگر ظاہر الروایۃ کے خلاف ہو اور مذہب کا کوئی قولِ ضعیف عرف کی موافقت میں ہو تو کیا اس کی گنجائش ہے کہ ظاہر الروایۃ کو ترک کر دیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ ہاں اس کی گنجائش ہے کہ اس صورت میں ظاہر الروایۃ کو ترک کر دیا جائے خواہ کوئی قول ضعیف عرف کے موافق ہو یا نہ ہو۔

علامہ شامیؒ نے ''نشر العرف'' میں فرمایا کہ:

''مسائل فقہیہ یا تو صریح نص سے ثابت ہوتے ہیں، یا اجتہاد ورائے سے

(۱) نقلہ عنہ العلامۃ ابوزھرۃؒ فی کتابہ: مالک وحیاتہ وآثرہ وفقہہ: ۳۵۶

ثابت ہوتے ہیں، اوران میں سے بہت سے مسائل کی بنا مجتہداپنے زمانے کے عرف پر رکھتا ہے،اس طرح کہ اگر وہ مجتہد نئے عرف کے زمانے میں ہوتا تو پہلے جو کہا تھا اس کے خلاف کہتا،اسی لئے فقہا نے لکھا ہے کہ اجتہاد کی شرطوں میں سے یہ ہے کہ مجتہد،لوگوں کے عرف وعادت سے واقف ہو،پس بہت سے احکام زمانے کے بدلنے کی وجہ سے بدل جاتے ہیں، کیونکہ اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے، یا کوئی ضرورت واقع ہوتی ہے یا اہل زمانہ میں کوئی فساد رونما ہوتا ہے۔اگر اب بھی پہلا حکم ہی برقرار رکھا جائے تو اس سے مشقت اور لوگوں کو نقصان لازم آتا ہے،...........
آگے فرمایا........اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ مشائخ مذہب نے بہت سے مواقع میں ان مسائل کے خلاف کیا ہے جن کی تصریح مجتہد نے کی ہے''۔(۱)

علامہ شامیؒ نے" عقود رسم المفتی" میں بھی اس کی تصریح کی ہے، اورایسے بہت سے مسائل ذکر کئے ہیں،جن کی مشائخ اور مجتہدین فی المذہب نے مخالفت کی ہے،حالانکہ وہ کتب ظاہر الروایۃ میں منصوص ہیں، پھر فرمایا کہ:

" هذا الذي جرأ المجتهدين في المذهب وأهل النظرالصحيح من المتأخرين على مخالفة المنصوص عليه من صاحب المذهب في كتب ظاهرالرواية بناءً على ما كان في زمنه ". (۲)

معلوم ہوا کہ ظاہر الروایۃ اگر عرف پر مبنی ہو اور نئے عرف کی مخالف ہو،تو نئے عرف کو لیکر ظاہر الروایۃ کو ترک کر دیا جائے گا اور چونکہ علماء نے اسکے لئے مذہب میں عرف حادث کے موافق کسی قول ضعیف کا ہونا شرط نہیں قرار دیا ہے، اس لئے خواہ قول ضعیف عرف کی موافقت میں موجود ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں ظاہر الروایۃ کو ترک

(۱) رسائل ابن عابدین:۱۲۵/۲ (۲) رسائل:۴۵/۱

کیا جاسکتا ہے، اورعرف کے موافق کوئی ضعیف قول موجود ہوتو وہ اتباع و اعتبار کا زیادہ مستحق ہے۔

(۲) عرف کی ایک مسلک سے مخالفت اور دوسرے سے موافقت ہوتو

عرف اوراقوال فقہاء میں تعارض کی ایک صورت یہ ہے کہ عرف ، مذاہب فقہیہ میں سے کسی مذہب کی کسی بات میں مخالف ہو اور اسی بات میں کسی اور فقہی مسلک کے وہ موافق ہو، اس صورت میں کیا جائز ہوگا کہ عرف کے موافق جو فقہی مسلک ہے اس کو اختیار کرلیا جائے ، اگر چہ کہ اپنے مسلک کے خلاف ہو اور کیا یہ خروج عن المذہب قرار دیا جائے گا؟

اس مسئلہ سے صراحةً تعارض کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا ، ہاں فقہاء کے اقوال سے اس مسئلہ کی تخریج کی جاسکتی ہے۔

علامہ شامی " عقود رسم المفتی" میں فرماتے ہیں:

" وربما عدلوا عما اتفق عليه أئمتنا لضرورة و نحوها كما مرّ في مسئلة الاستيجار على تعليم القرآن ونحوه من الطاعات التي في ترك الاستيجار عليها ضياع الدين، كما قررنا ه سابقاً يجوز الافتاء بخلاف قولهم ، قال : و الحاصل أن ما خالف فيه الأصحاب إمامهم الأعظم لايخرج عن مذهبه إذا رجحه المشائخ المعتبرون، و كذا ما بناه المشائخ على العرف الحادث لتغير الزمان أو للضرورة و نحو ذلك لايخرج عن مذهبه؛ لأن مارجحوه لترجيح دليله عندهم ماذون فيه من جهة الأمام". (۱)

اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

---

(۱) عقود رسم المفتی ، رسائل شامی: ۲۵/۵

(۱) ائمہ حنفیہ کا جس بات پر اتفاق ہے، ضرورت اگر داعی ہو تو اس سے عدول کرنا جائز ہے۔

(۲) اگر مشائخ نے اس بات کو زمانے کے تغیر کی وجہ سے عرف جدید پر مبنی کیا ہے، تو اس کو خروج عن المذہب نہیں کہا جائے گا۔

اور یہ معلوم ہے کہ مشائخ نے تعلیم قرآن، امامت، اذان وغیرہ طاعات پر اجرت لینے کے جواز کا فتوی دیا ہے؛ حالانکہ یہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور مام محمدؒ تینوں کے متفقہ قول کے خلاف ہے، ہاں امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز ہے، تو ہمارے مشائخ نے ائمہ احناف کے مسلک سے عدول کر کے امام شافعیؒ کا مسلک تغیر احوال و ایام کی بنا پر اختیار فرمایا ہے اور اس عدول کو خروج عن المذہب نہیں قرار دیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح ائمہٗ مذہب کے متفقہ قول سے ضرورتِ داعیہ کی بناء پر عدول کرنا خروج عن المذہب نہیں، اسی طرح اگر عرف و عادت میں تغیر کی بناء پر ایک فقہی مذہب سے عدول کیا جائے تو اس کو بھی خروج عن المذہب نہیں قرار دیا جا سکتا؛ کیوں کہ خود امام کی طرف سے اس کی گنجائش دی گئی ہے حتیٰ کہ اگر وہ حیات ہوتے تو عرفِ جدید کے مطابق یہی حکم فرماتے۔ (واللہ اعلم)

کیا نئے عرف کی اتباع واجب ہے؟

جیسا کہ اوپر معلوم ہوا بعض احکام عرف و عادت پر مبنی ہوتے ہیں، اگر یہ عرف و عادت بدل جائے تو سوال یہ ہے کہ اس نئے عرف و عادت کے مطابق حکم دینا واجب و ضروری ہے یا صرف جائز ہے؟ فقہاء کی عبارت سے ظاہر یہی ہے کہ عرف جدید کا اتباع واجب ہے اور کتب ظاہر الروایۃ میں منقول پر جمود جائز نہیں۔

امام قرافی مالکیؒ نے تو حد کردی ،انہوں نے فرمایا کہ جن احکام کا مبنی عرف وعادت پر ہے ، ان کو عادات کے بدل جانے کے باوجود اسی طرح باقی رکھنا اجماع کے خلاف اور دین سے جہالت ہے ، بلکہ جو چیز شریعت میں عادات کے تابع ہو،تو اس میں عادات کے بدل جانے سے حکم بھی نئی عادت کی طرف بدل جاتا ہے۔ (علامہ قرافیؒ کی اصل عبارت قاعدہ نمبر ۲۰ کے تحت ہم نے درج کی ہے،وہاں دیکھی جائے)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرف کے بدل جانے سے عرف جدید کا اتباع واجب ہےاور پہلے حکم پر جمود جائز نہیں۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: " إن المفتي ليس له الجمود على المنقول في كتب ظاهر الرواية من غير مراعاة الزمان و أهله وإلا يضيع حقوقاً كثيرةً و يكون ضرره أعظم من نفعه"۔(۱)

یہ عبارت بھی اس پر شاہد ہے کہ مفتی کیلئے جائز نہیں کہ فقہائے متقدمین نے اپنے زمانے کے عرف پر جن احکام کو مبنی فرمایا ہےان پر جمود کرے، بلکہ اس پر ضروری وواجب ہے کہ نئے عرف وعادت کی مراعات کرے، جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے،اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے،اور حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے کا مرتکب ہوتا ہے،اوراس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں جیسے تحلیل حرام اور تحریم حلال ، غیر واجب کو واجب کرنا ، دین خداوندی میں تغیر اور اللہ ورسول اللہ پر جھوٹ وغیرہ۔اس لئے مفتی پر ضروری ہے کہ عرف پر مبنی مسائل میں اپنے زمانے میں لوگوں کے عادات واعراف کے مطابق فتوے دے، نہ یہ کہ فقہائے متقدمین نے اپنے

(۱)عقود رسم المفتی ،رسائل شامی:۲۵/۵

زمانے میں جس کا حکم بیان کیا ہے اس کے مطابق فتوے، یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دقیق فہم اور عریض علم کی محتاج نہیں۔

ہاں مگر مفتی پر ضروری ہے کہ اس کو صحیح نظر حاصل ہو اور احکام شرعیہ اور قابل رعایت شرائط اور عرف وعادات سے کامل واقفیت ہو، نیز اسکو یہ معلوم ہو کہ یہ عرف عام ہے یا خاص اور یہ کہ یہ نص کے خلاف ہے یا نہیں، تا کہ ایسے مواقع پر عرف کے موافق فتویٰ نہ دیدے، جہاں شارع کی طرف سے نص وارد ہے یا کہیں عرف خاص پر ایسی جگہ فتوے نہ دیدے جو نص یا قیاس کے معارض ہے۔

فقط

العبد محمد شعیب اللہ خان مفتاحی عفی عنہ
جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم۔ بنگلور

